اصول تفسیر

آیۃ اللہ محمد فاضل لنکرانی

تفسیر سے ہماری مراد کتاب عزیز قرآن مجید کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد کو کشف کرنا ہے. جس طرح کہ انسانوں میں سے تمام متکلمین کی کتب سے ان کی مراد کو سمجھنا کہ جو اپنے مقاصد کو اور اپنی مرادوں کو بیان کرنے کے لئے لکھتے ہیں :

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہمارا بیان کردہ یہ معنی تفسیر کے لغوی معنی کے مطابق ہو یا اس سے الگ خاص معنی ہو... تفسیر کا لغوی معنی ہے "پردہ اٹھانا" اور ہمیں اس بحث کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارا مقصد یہ وضاحت کرنا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے ؟ اور لفظ تفسیر سے اسی مراد پر دلالت مقصود ہے. اس کے لغوی معنی اور وہ خصوصیت جو اس لغوی معنی میں مقصود ہوتی ہے اس کے بیان سے غرض نہیں، اگرچہ بالآخر اس کو بھی دخل حاصل ہوتا ہے. تاہم فی الحال ہمارا ارادہ اس لغوی بحث میں پڑنے کا نہیں ہے.

پس تفسیر کے اس مرادی معنی کے لئے فقط اسی چیز پر اعتماد کیا جا سکتا ہے جس کا معتبر اور حجت ہونا ثابت ہے لہذا اس میں ظن اور استحسان پر اعتماد نہیں ہو سکتا اور ان کے علاوہ بھی کسی ایسی چیز پر بھروسہ نہیں ہو سکتا کہ جس کی حجیت پایہ ثبوت کو نہ پہنچی ہو. مثلاً کسی مفسر کا قول بھی قابل اعتماد نہیں خواہ وہ قدیم ہو یا جدید اور موافق ہو یا مخالف، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمیں ظن کی متابعت سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے سورۃ اسراء میں فرمایا ہے :

وَلاَ تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (بنی اسرائیل : ۳۶)

(اور تو اس کے پیچھے مت چل جس کا تجھے یقین نہیں)

دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی بھی بات کو اذن خدا کے بغیر اللہ کی طرف منسوب کرنا حرام ہے اور وہ ذات ایزدی پر افتراء قرار پاتا ہے : چنانچہ سورہ یونس میں ارشادِ الٰہی ہوتا ہے :۔

قُلْ آللّٰهُ اَذِنَ لَکُم اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُونَ (یونس : ۵۹)

(کہہ دو کیا اللہ نے تمہیں اذن دیا تھایا تم اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہو ؟)

ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں جو علم ویقین کے بغیر قول و عمل بجالانے سے منع کرتی ہیں اور تفسیر بالرائی سے روکتی ہیں (جبکہ بنیاد یہ ہو کہ تفسیر کا یہاں عمومی معنی مراد ہے)۔ اس کے ساتھ ساتھ عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ یقین کی پیروی کی جائے اور ظنی امور کی اتباع نہ کی جائے۔

مختصر یہ کہ تفسیر کے لئے یہی راستہ ہے اور اسی پر بھروسہ کیا جائے کہ شرعی یا عقلی طریقے سے اس کا معتبر اور حجت ہونا یقینی ہو۔

پس قرآن مجید سے اللہ تعالیٰ کی مراد معلوم کرنے کے طریقے یہ ہیں :

۱. کتاب کے ان ظاہری معانی کی اتباع کہ جنھیں ایک فصیح عربی دان اس سے سمجھتا ہے اور صحیح لغت بھی اس کی تائید کرتی ہے، جیسا کہ ہم عنقریب ثابت کریں گے کہ کتاب کے ظواہر حجت ہیں۔

۲. صحیح عقل فطری کے فیصلے کی اتباع کہ جو اساس توحید ہے اور رسالت کو ثابت کرنے والی اس معجزانہ کتاب کے اعجاز سے متصف کرنے کی بنیاد ہے اور ان امور میں مرجع کی حیثیت رکھتی ہے لہذا صحیح عقل فطری کی حجیّت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

۳. فرمان معصوم (نبی یا امام) جو یہ ہستیاں اللہ تعالیٰ کے کلام مبارک کی مراد کے متعلق فرمائیں وہ واجب التعمیل اور حجت ہے۔ ذیل میں ہم انہی تین امور کے بارے میں بحث کریں گے جو کہ اصول تفسیر ہیں۔

امر اول

ظواہر کتاب

ظاہر قرآن جو ہمارے نظریہ کے مطابق حجت ہے، جبکہ محدثین کی ایک جماعت اس کی حجیت سے منکر ہے۔ اس ظاہر قرآن سے ہماری مراد وہ ظاہری معنی ہے جسے ہر وہ شخص سمجھتا ہے جو صحیح اور فصیح عربی زبان سے آشنائی رکھتا ہو۔ نیز اس معنی کے خلاف کوئی معتبر عقلی یا نقلی قرینہ بھی قائم نہ ہو۔ لہذا درج ذیل آیات کہ جن میں

خلافِ ظاہر معانی مراد ہونے پر عقلی و قطعی قرائن موجود ہیں، یہ ہماری اس بحث سے خارج ہیں. مثلاً

" وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا " (فجر : ۲۲)

" اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى " (طهٰ : ۵)

" وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيْهَا " (يوسف : ۸۲)

اسی طرح وہ ظواہر بھی خارج ہو جاتے ہیں جن کے خلاف معتبر نقلی قرائن قائم ہوں، جیسے وہ عمومات جن کی روایات کے ساتھ تخصیص ہو جائے گی اور جو مقدار تخصیص کے مورد سے باہر ہو گی اس میں ظاہر حجت رہے گا. یہی حالت ان مطلقات کی ہوتی ہے جو دیگر تقییدی روایات کے ساتھ مقید ہو جاتے ہیں یعنی اس تقیید کی حد تک ان کا ظواہر حجت نہیں ہوتا اور بقایا حصہ حجت رہ جاتا ہے بہر حال تمام ایسے ظواہر جن کے خلاف معتبر نقلی قرائن موجود ہوتے ہیں وہ ہماری اس بحث سے خارج ہیں اب ظواہر میں سے حجت قرار پانے والی مقدار کی وضاحت ہو چکی ہے تو اب ہم اس مرحلے میں ہیں کہ ظواہر کی حجیّت پر دلائل پیش کریں.

ظواہر کتاب کی حجیت کے دلائل

دلیل اول : اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کے نزول اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس کو پیش کرنے کا مقصد یہی ہے کہ لوگ اس کے معانی کو سمجھیں. وہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں، اپنے تمام اعمال کو اس کے اوامر و نواہی کے مطابق بنائیں اور ان عقائد صحیحہ کے ساتھ ہم آہنگ رہیں جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں.

یہ بھی واضح ہے کہ شارع مقدس (ص) نے اپنے مقاصد کے افہام و تفہیم کے لیے کوئی نیا اور خصوصی طریقہ ایجاد نہیں فرمایا، بلکہ لوگوں سے اسی طرز پر گفتگو کی اور اسی اسلوب افہام کو اپنایا ہے جو لوگوں کے درمیان رائج تھا یعنی انھی جیسے الفاظ و عبارات میں اپنے اغراض کو بیان فرماتے تھے. پس اب ضروری ہے کہ کتاب خدا کے ظواہر کو بھی اسی طرح معتبر قرار دیا جائے جس طرح دیگر ایسی کتب کے ظواہر کو معتبر قرار دیا جاتا ہے جو اغراض و مقاصد کی تفہیم کے لیے لکھی جاتی ہیں. ایسا کیوں نہ ہو ____ جبکہ خود قرآن اپنی آیات میں تدبر کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور بالخصوص عدم تدبر کو ناپسند کرتا دکھائی دیتا ہے ____ چنانچہ فرماتا ہے :

" اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا "

(سورہ نساء . آیت نمبر ۸۲)

"کیا وہ قرآن مجید میں تدبر نہیں کرتے حالانکہ اگر وہ کسی غیر اللہ کی جانب سے ہوتا تو وہ اس میں کثیر اختلاف پاتے).

ارشاد ہوتا ہے :

" اَفَلاَ یَتَدَبَّرُونَ الْقُرآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُھَا "(سورہ محمد آیت ۲۴)

(کیا وہ قرآن مجید میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں)

اسی طرح قرآن کریم نے اپنے بارے میں ایسے اوصاف اور خصوصیات بیان کی ہیں کہ ان کو دیکھنے کے بعد اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ قرآن کے ظواہر کو معتبر تسلیم کیا جائے.

مثلاً قرآن بیان کرتا ہے :

"یہ کتاب ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے جانے والی ہے".

"یہ کتاب لوگوں کے لیے بیان ہے یعنی وضاحت کرنے والی ہے".

"یہ کتاب اہل تقویٰ کے لیے ہدایت اور موعظہ ہے".

"اس میں لوگوں کے لئے ہر قسم کی مثالیں دی گئی ہیں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں" اس قسم کے دیگر ایسے اوصاف، امتیازات اور خصوصیات کا تذکرہ فرماتا ہے جن سے ظواہرِ کتاب کا حجت قرار دینا لازمی ہو جاتا ہے.

دلیل دوم

گزشتہ مباحث میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید ہی وہ منفرد ابدی معجزہ ہے جو قیامت تک کے لیے نبوت و رسالت کا ثبوت بن کر آیا ہے اس نے اولین و آخرین کے تمام افراد بشر بلکہ جنات کو بھی چیلنج کیا ہے کہ اس قرآن کی مثل لا کر دکھائیں یا اس کی مثل دس سورتیں یا ایک سورہ ہی بنا کر دکھائیں. اگر عرب قبائل قرآن کے معانی نہ سمجھ سکتے ہوتے یا اس کے الفاظ و آیات سے اللہ تعالیٰ کے مقاصد کا ادراک کرنے سے محروم ہوتے، یا قرآن ناقابل فہم و پیچیدگیوں پر مشتمل کلام ہوتا، تو اس کا وصف اعجاز سے متصف ہونا، مقابلے کا مطالبہ اور مثل پیش کرنے کا چیلنج بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے.

دلیل سوم

فریقین (شیعہ و اہل سنت) کے ہاں حدیث ثقلین ایک معروف حدیث ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ (قرآن و اہل بیت) ہر دو سے تمسک کرنا ضروری ہے. نیز ضلالت سے چھٹکارا پانے کا واحد راستہ یہی تمسک ہے اور ہمیشہ کے لیے گمراہی میں مبتلا ہونے سے بچاؤ کا بس یہی ایک ذریعہ ہے.

ہم اپنے اس موضوع میں حدیثِ ثقلین سے یوں استدلال کر سکتے ہیں کہ ثقلین میں سے ایک کتاب خدا

قرآن مجید ہے اور واضح ہے کہ اس سے تمسک کرنے کا مطلب فقط یہی نہیں کہ اس کے من عند اللہ نازل ہونے، رسالت کے لیے حجت اور نبوّت پر دلیل ہونے پر اعتقاد رکھ لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ اس کتاب کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت ثابت ہو جاتی ہے بلکہ وہ ایسا تمسک ہے کہ جس کے ذریعے گمراہی سے ابدی نجات ہو سکتی ہے اور وہ ہے قرآن مجید کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا، اپنی زندگی کو اس میں موجود حقائق کے مطابق ڈھال لینا اور گزشتہ دور کے قصص اور واقعات میں اسی کی طرف استناد کرنا.

بالفاظ دیگر تمسک کا معنی وہی ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سابقہ ارشاد میں بیان فرمایا ہے کہ قرآن مجید کو اپنا امام و قائد تسلیم کیا جائے اور اس کے ارشادات کی تعمیل کی جائے تاکہ وہ اپنے پیروکار کو جنّت میں لے جائے. ہاں تو تمسک کا یہ مفہوم قرآن مجید کے ظاہر کو حجت قرار نہ دینے سے حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر قرآن اپنے تمام موارد میں مزید وضاحت کا محتاج ہو اور بذات خود قابل ادراک و معرفت نہ ہو تو اسے امام و قائد کس طرح مانا جائے گا اور اس کی پیروی کیسے ہو سکے گی ؟لہذا قرآن کے ظواہر کو حجت قرار دیئے بغیر کوئی راستہ نہیں (جیسا کہ اہل خبر پر مخفی نہیں ہے).

دلیل چہارم

ایسی بہت سی متواتر روایات موجود ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ روایات قرآن مجید پر پیش کی جائیں. پھر جو روایات اس کتاب کے مخالف ہوں انھیں دور پھینک دیا جائے، یا دیوار پر مار دیا جائے. اس قسم کی مختلف تعبیروں اور طرح طرح کے الفاظ سے اسی مطلب کو ادا کیا گیا ہے. مثلاً وہ مخالف روایات ناکارہ ہیں، باطل ہیں، معصومین علیہم السلام کا کلام ہی نہیں ہیں.

وہ روایات بھی اسی قبیل سے ہیں جو شروط کے بیان میں وارد ہوئی ہیں اور بتاتی ہیں کہ ہر شرط جائز اور نافذ ہو سکتی ہے مگر وہ نہیں جو مخالف کتاب خدا ہو. اب مخالف کتاب خدا شرط کی تعیین اور غیر مخالف سے اس کی شناخت کرنے کے لیے عرف ہی کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور عرف کتاب خدا کی طرف رجوع کیے بغیر فیصلہ نہ دے سکے گا. پس بات اس وقت تک طے نہ ہو سکے گی جب تک اہل عرف قرآن کو سمجھنے اور اس کے مقاصد کو اس کے الفاظ سے حاصل کرنے اور اس کی اغراض کو آیات سے درک کر لینے پر قادر نہ ہوں بنابر ایں ماننا پڑے گا کہ عرف قرآن فہمی کی اہلیت رکھتا ہے.

اگر اس مقام پر کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے لگے کہ ان دونوں قسم کی روایات میں مخالف کتاب سے مراد فقط

وہ ہے جو قرآن کی تصریحات کے خلاف ہو، لیکن جو روایت قرآن مجید کے ظواہر کے خلاف ہو وہ اس کی مخالف نہیں ہے، اس لئے کہ معنای ظاہری میں ویسے بھی احتمالِ خلاف کی گنجائش موجود ہوتی ہے کہ وہ قطعی اور حتمی نہیں ہوتا اور اس میں بحث کا جواز برقرار ہوتا ہے. مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ دعویٰ انتہائی کمزور، فاسد اور اس حد تک حقیقت سے دور ہے کہ محتاج وضاحت نہیں ہے.

دلیل پنجم

آئمہ ہدیٰ سے ایسی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں وہ بہت سے موارد میں قرآن مجید سے استدلال فرماتے ہیں:

۱۔ زرارہ نے امام علیہ السلام سے پوچھا:

" آپ نے کہاں سے جان لیا کہ مسح سر کے کچھ حصے پر کافی ہے؟"

آپ نے فرمایا:

"بسبب اس "با" کے جو آیت میں موجود ہے"(۱)

یہاں حضرت کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر سائل آیت وضو میں موجود اس نکتے کی طرف متوجہ ہو جاتا تو ایسا سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کیونکہ "الباء" تبعیض میں ظہور رکھتی ہے، ظہور حجت ہوتا ہے اور یہ دونوں باتیں ناقابل انکار ہیں۔

سوال:۔ شاید سائل کے سوال کی علت ہی یہی ہو کہ آیت وضو سر کے کچھ حصہ پر مسح کرنے میں ظہور نہیں رکھتی، اس لئے کہ "الباء" کا تبعیض میں ظہور نہیں ہے: اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کی پیش کردہ یہ روایت معنیٰ ظاہری کی حجیّت پر دلیل نہ بن سکے گی.

جواب:۔ امام علیہ السلام کا مقام جواب میں "لمکان الباء" پر اختصار کر لینا اور اس بارے میں دوسری کوئی دلیل نہ دینا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ "الباء" کا تبعیض میں ظہور رکھنا ایک غیر مخفی، واضح اور روشن امر ہے. اگر ایسا نہ ہوتا تو امام علیہ السلام فقط اس پر اختصار نہ فرماتے (جیسا کہ ظاہر ہے).

۲۔ وہ شخص جو بیت الخلاء میں اس لیے زیادہ دیر تک بیٹھا رہا کہ وہاں غناء کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ اپنا عذر یہ قرار دیتا تھا کہ خود اپنے قدموں سے تو اسے سننے کے لیے نہیں آیا(آیا تو قضاء حاجت کے لیے ہے اور غناء کی آواز تو ویسے ہی کانوں میں آرہی ہے)۔

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا : کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا ؟

" اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُلاً " (اسراء : ۳۶)

(تحقیق کان، آنکھ اور دل ان سب کے متعلق انسان سے پرسش ہوگی)

مخاطب کہتا ہے کہ یہ سن کر گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیت میں نے آج سے پہلے سنی ہی نہ تھی . (۱)

۳۔ امام علیہ السلام نے تین مرتبہ طلاق شدہ عورت کے ساتھ ایک عبد مملوک کا جدید نکاح حلال قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

" حَتّٰى تَنكِحَ زَوْجاً غَيرَهُ " (بقرہ : ۲۳۰)

(یہاں تک کہ وہ اس شوہر کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ نکاح کرے)۔

یہ پڑھ کر فرمایا کہ جب اس عورت نے کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرنا ہے تو وہ غلام بھی پہلے شوہر کے سوا ایک شوہر ہے . (۲)

۴۔ تین مرتبہ طلاق شدہ عورت کے کسی کے ساتھ عقد منقطع (متعہ) کرنے سے وہ طلاق دینے والے کے لیے حلال نہیں ہوسکتی۔ اس مسئلے کی وضاحت میں امام علیہ السلام نے یہ آیت پیش فرمائی :۔

" فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا " (بقرہ : ۲۳۰)

"اگر وہ اس عورت کو طلاق دے دے تو پھر ان دونوں (سابقہ شوہر اور زوجہ) کے لیے کوئی حرج نہیں کہ دوبارہ باہمی رجوع کریں اور نکاح کرلیں)"۔

مزید فرمایا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کا ذکر کیا ہے جبکہ متعہ میں طلاق نہیں ہوتی (لہذا حلالہ کے لیے متعہ نہیں نکاح دائم ہی کافی ہوسکتا ہے)(۱)

۵۔ اگر ایک شخص کو ٹھوکر لگے ، اس کا ناخن ٹوٹ جائے اور وہ اپنی انگلی پر پٹی باندھ لے (تو اس کا وضو کیسے ہوگا ؟)

امام علیہ السلام نے فرمایا : ایسی تمام صورتوں کا حکم قرآن مجید سے مل سکتا ہے۔ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے :

" وَمَا جَعَلَ عَلَيكُمْ فِی الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ " (حج : ۷۸)

(اور اللہ تعالیٰ نے تم پر اپنے دین میں کوئی دکھ نہیں رکھا)۔

پھر فرمایا : آپ اس پٹی پر مسح کرلیجیے۔ (۲)

۶۔ تفسیر عیاشی میں ابن مسلم نے حضرت امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے کہ آپ

نے فرمایا: حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے سامنے یہ مقدمہ آیا کہ ایک عورت سے ایک مرد نے شادی کی، اس نے اس عورت اور اس کے گھر والوں کے لیے یہ شرط لگائی کہ اگر اس مرد نے اس عورت کے اوپر کسی دوسری عورت سے شادی کی یا اسے جدا کر دیا یا اس کے اوپر کسی کنیز کو لایا تو یہ اس عورت کے لیے طلاق ہے۔ اس پر حضرت امیر المومنینؑ نے فیصلہ فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تمہاری شرط سے قبل ہی شرط لگادی ہے، لہٰذا اگر وہ چاہے تو اپنی شرط کو پورا کرے اور اگر چاہے تو اس عورت کے ہوتے ہوئے دوسری شادی بھی کر لے، چاہے تو کنیز لے آئے اور وہ اس عورت کو جدا بھی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ عورت کوئی ایسا کام کرے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے:

" فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلَاثَ وَ رُبَاعَ "

(پس تم نکاح کر سکتے ہو عورتوں میں سے جو تمہیں اچھی لگیں دو یا تین یا چار)۔(نساء: ۳)

اور فرماتا ہے: " وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ "

(اور ان کنیزوں کو بھی لے سکتے ہو جو تمہاری ملکیت ہوں)

اور فرماتا ہے: " وَالّٰتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ ...الآية "

(اور وہ عورتیں جن کے نافرمان ہونے کا تمہیں خوف ہو...)(نساء: ۳۴)

۷۔ من لایحضرہ الفقیہ میں ہے کہ زرارہ ابو عبداللہ سے اور وہ ابو جعفر سے روایت کرتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

"ایک غلام کے لیے نہ تو نکاح کرنا جائز ہے اور نہ ہی طلاق دینا مگر اپنے مالک کے اذن کے ساتھ"۔

میں نے پوچھا:

"اگر اس کی مالکہ ایک عورت ہو تو اس غلام کی بیوی کی طلاق کس کے ہاتھ میں ہوگی"؟

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اسی مالکہ کے ہاتھ میں کیونکہ ارشاد خداوندی ہے:"

" ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً عَبداً مَمْلُوكًا لاَ يَقْدِرُ عَلٰى شَىءٍ "

(خداوند تعالیٰ مثال پیش کرتا ہے ایک غلام کی جو کسی شے پر بھی قادر نہیں ہوتا)(نحل: ۷۵)

پھر فرمایا: طلاق بھی تو ایک شے ہی ہے۔

۸۔ ان مقامات کے علاوہ ایسے موارد بکثرت موجود ہیں جو فقہ کے ابواب میں مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں امام علیہ السلام قرآن مجید سے استدلال فرماتے ہیں، بالخصوص جب ان لوگوں کا مقابلہ کر رہے

ہوتے ہیں جو آپ کی امامت کے منکر ہیں تو وہاں بکثرت استدلال بالقرآن فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر آئمہ علیہم السلام کا ذوق یہی ہوتا کہ ظاہر قرآن ان کے اغیار کے لیے حجت نہیں ہے تو وہ ان کے مقابلے میں ظاہر قرآن سے کبھی استدلال نہ فرماتے، کیونکہ پھر اس کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی تھی۔

(پس ان تمام استدلالات سے ظاہر قرآن کا حجت ہونا روشن ہو جاتا ہے)۔

منکرینِ حجیت ظواہرِ کتاب کے دلائل

وہ محدّثین جو ظواہر قرآن کی حجّیت کے منکر ہیں ــــــ وہ بھی چند ایک دلائل کا سہارا لیتے ہیں:

دلیل اول

فریقین کے ہاں متواتر روایات میں قرآن مجید کی تفسیر بالرائی کرنے سے نہی وارد ہوئی ہے اور ایک روایت میں یوں آیا ہے:

" مَنْ فَسر القران برأيه فليتبو أمقعده مِنَ النَّار "

(جو شخص قرآن مجید کی تفسیر اپنی رائے سے کرے وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں تیار کرے گا)۔

قرآن مجید کے ظواہر پر بھروسہ کرنا بھی اسی تفسیر بالرائی کے مصادیق میں سے ہے، کیونکہ وہ فقط یہی تو نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اور مصداق یہ ہوتا ہے کہ ظن یا استحسان کا سہارا لیتے ہوئے متشابہ یا مبہم آیت کو اس کے دو یا چند معانی میں سے کسی ایک پر حمل کر دیا جائے بہر حال تفسیر بالرائی کا ایک مصداق قرآن مجید کو اپنے ظاہری معانی پر حمل کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی ہوتا ہے۔

جواب

ا۔ لغت اور عرف میں لفظ تفسیر کا معنی پردہ ہٹانا اور کسی پردہ پوش امر کو ظاہر کر دینا ہے۔ اب یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کسی لفظ کے ظاہری معنی کو اختیار کر لینا اس مذکورہ معنی کے اعتبار سے تفسیر نہیں کہلا سکتا، مثلاً اگر کسی شخص نے کہا ہو "رایت اسداً" اب اگر سننے والا یہ خبر دے کہ فلاں شخص نے شیر دیکھا ہے تو نہیں کہا جائے گا کہ اس نے اس کلام کی تفسیر کی ہے، اسی لیے تو عرف عام میں یہ مثال مشہور ہو گئی ہے۔

"واقعہ ایک شے اور اس واقعہ کی تفسیر کرنا ایک دوسری شے ہوتا ہے"۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک لفظ کو اس کے ظاہر پر حمل کرنا تفسیر نہیں کہلاتا۔

بنابریں روایات میں جو تفسیر بالرائی کی مذمت کی گئی، وہ آیات کو ان کے ظواہر پر حمل کرنے پر صادق

نہیں آتی ـــــ بلکہ یہ امر تو ان روایات کے مورد سے موضوعاً خارج ہے۔

۲۔ بالفرض اگر تسلیم کر لیا جائے کہ ظاہری معانی کا اختیار کرنا تفسیر کہلا سکتا ہے تو بھی اسے تفسیر بالرائی کہنا بالکل بے جا ہے، اس لیے وہ روایات متواترہ جو تفسیر بالرائی سے نہی فرما رہی ہیں، ان کی نہی اسے شامل نہ ہو گی۔

بالفاظِ دیگر ان روایات سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تفسیر کی دو قسمیں ہیں۔
تفسیر بالرائی اور تفسیر بغیرہ۔

اب یہ استدلال کرنے والے کا فریضہ ہے کہ ثابت کرے کہ لفظ سے ظاہری معنی مراد لینا پہلی قسم یعنی تفسیر بالرائی کے مصادیق میں ہے۔ جب وہ کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے تو ہمارے نظریے کے صحیح ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، کیونکہ جب اس کے تفسیر بالرائی ہونے میں شک ہوا تو وہ تفسیر بالرائی نہ ہو گی۔ پس روایات نہی بذات خود تو اس مقام کو شامل نہیں ہو سکتیں، کیونکہ جب تک ان روایات کا موضوع حتمی اور یقینی طور پر واضح نہ ہو اور تفسیر بالرائی کا عنوان پایہ ثبوت کو نہ پہنچے، ان کے سہارے لفظ سے ظاہری معنی مراد لینا ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ لفظ سے ظاہری معنی مراد لینا اگر تفسیر کے مصادیق میں سے قرار دے دیا جائے تو بھی اسے تفسیر بالرائی کہنا بالکل غلط ہے، کیونکہ واضح ہے کہ جو شخص "نہج البلاغہ" کے خطبات میں سے کسی خطبہ کا ترجمہ کرے، اس کی عبارات سے جو کچھ ظاہر ہو رہا ہو اس کے مطابق ترجمہ کرے کہ عربی دان افراد عبارتوں میں قرائن داخلیہ و خارجیہ کی رعایت کرتے ہوئے جو معنی مراد ان کی سمجھ میں آتا ہے اور وہ اسے ترجمے کے طور پر ذکر کرتے ہیں، اگر یہ شخص اسی طرح کا ترجمہ بیان کرے تو کیا اس کا یہ عمل تفسیر بالرائی کہلائے گا؟ ـــــ ہرگز نہیں، اسے کسی بھی طرح تفسیر بالرائی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا تفسیر بالرائی کا معنی یہ ہے کہ کتاب خدا کی طرف رجوع کرنے میں خود کو اس قدر مستقل خیال کرنا ہے کہ اس میں حضور اکرمؐ کے اوصیاء علیہم السلام سے پوچھنے کی ضرورت ہی تسلیم نہ کرنا کہ جنھیں قرآن کے ساتھ دوسرا ثقل قرار دیا گیا ہے۔ نیز ان سے تمسک کرنا اور ان کی طرف مراجعت کرنا اسی طرح لازم اور واجب کیا گیا ہے جس طرح خود قرآن مجید سے تمسک واجب ہے۔ پس تفسیر بالرائی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ کوئی فرد کسی متشابہ آیت کی ایسی تاویل کرے جسے اس کی اپنی رائے چاہتی ہو اور وارثان نبوت یعنی آئمہ علیہم السلام کی طرف مراجعہ نہ کرے ـــــ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی نکتے کی طرف یوں اشارہ فرمایا:

"لوگ متشابہ میں ہلاک ہو گئے، کیونکہ انھیں اس کے معنی سے واقفیت اور اس کی حقیقت کی معرفت تو ہوتی نہیں، لیکن اپنی دلی رائے کے مطابق اس کی ایک تاویل وضع کر لیتے ہیں۔ وہ اوصیاء رسول صلی اللہ علیہم اجمعین سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے اور ان سے مستغنی ہو جاتے ہیں حالانکہ انھیں چاہیے تھا کہ ان سے پوچھتے تاکہ وہ انھیں اس کی صحیح تاویل سے آگاہ کرتے۔"

تفسیر بالرائی یوں بھی ہوتی ہے کہ کسی لفظ کے ظاہر میں عموم یا اطلاق یا اس کی مثل کو دیکھتے ہوئے اسی پر حمل کر لینا اور اس تحضیض یا تقیید یا قرینہ کی پرواہ نہ کرنا جو آئمہ ہدیٰ علیہم السلام سے نقل ہوا ہو۔ (یعنی فرامین واحادیث معصومین علیہم السلام کو مخصص یا مقید تسلیم نہ کرنا) اور واضح ہے، جن ظواہر کتاب کی حجیت کے متعلق بحث چل رہی ہے، اس سے یہ صورت ہر گز مراد نہیں ہے۔

۳۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ظاہر قرآن کو اخذ کرنا تفسیر بالرائی کے ضمن میں آتا ہے، تاکہ تفسیر بالرائی سے منع کرنے والی احادیث اس کو شامل ہو جائیں تو ہمارا جواب یہ ہو گا کہ اب یہ دو قسم کی روایات کے مابین جمع ضروری ہو جائے گی۔ ایک قسم تو انھی تفسیر بالرائی سے مانع روایات کی ہے اور دوسری قسم میں وہ روایات ہیں جو اپنے ظہور کے ساتھ ظواہر کتاب کی حجیت کو ثابت کر رہی ہیں بلکہ صراحت کر رہی ہیں کہ ظواہر کتاب حجت ہیں۔ یہ دونوں قسمیں باہمی تعارض کریں گی تو اس کا حل ان کو جمع کرنا ہو گا اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ان تفسیر بالرائی سے مانع روایات میں اس کے وہ مصادیق مراد لیے جائیں جو ظاہر قرآن کو اپنانے کے علاوہ ہیں اور ان کی نسبت زیادہ واضح طور پر تفسیر بالرائی کے تحت آتے ہیں، جیسا کہ متشابہ کو اپنی مرضی کی کسی تاویل پر حمل کر دینا یا کلام کو معنی ظاہری پر محمول کرنا اور مخالف قرینہ کی پرواہ نہ کرنا ہے۔ پس اس طرح دونوں قسم کی روایات کے درمیان جمع کا راستہ نکل آئے گا۔ اور واضح ہے کہ جمع کے لیے اس راہ کے علاوہ اور کوئی راہ ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ گزشتہ روایات ظواہر کتاب کی حجیّت کو بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہیں اور ان سے انحراف کی کوئی گنجائش نہیں (پس نتیجہ یہ ہو گا کہ ظواہر کتاب حجت رہیں گے اور تفسیر بالرائی کے دیگر تمام مصادیق ممنوع قرار پائیں گے)

دلیل دوم

ظواہر قرآن کی حجیّت کے منکرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فہم القرآن فقط ان اہل الکتاب اور ان اہل الذکر کا خاصہ ہے جن پر قرآن نازل کیا گیا اور وہ آئمہ معصومین علیہم السلام میں اس دعویٰ کی دلیل چند ایک روایات

ہیں جن کا ظاہری مفہوم اس مطلب کو ثابت کرتا ہے۔

ا۔ شعیب بن انس کی ایک مرسلہ روایت میں حضرت امام ابو عبداللہ جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ابو حنیفہ سے کہا: "کیا تم اہل عراق کے فقیہہ ہو"۔

اس نے جواب دیا: "جی ہاں"!

امام علیہ السلام نے پوچھا:

"تم انھیں کس شے کے ذریعے فتویٰ دیتے ہو"؟

اس نے جواب دیا:

"کتاب خدا اور سنت نبی اکرمؐ کے ذریعے سے"۔

"اے ابو حنیفہ! کیا تم کتاب خدا کو اس طرح جانتے ہو جس طرح جاننے کا حق ہے؟ کیا تمہیں ناسخ و منسوخ کی پہچان ہے"؟

اس نے کہا: "ہاں!"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"اے ابو حنیفہ! افسوس ہے تم ایسے علم کا دعویٰ کر رہے ہو جو اللہ تعالیٰ نے فقط ان ہستیوں کو عنایت فرمایا ہے جو اس کتاب کے اہل ہیں اور ان پر یہ نازل کی گئی ہے۔ یہ علم قرآن تو ہمارے نبی اکرمؐ کی ذریت کے ہاں خصوصی طور پر موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی کتاب کے علم میں سے ایک حرف کا بھی وارث نہیں بنایا۔"

۲۔ زید الشحام سے روایت ہے کہ ایک دن قتادۃ امام ابو جعفر محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تو امام علیہ السلام نے پوچھا:

"کیا تم اہل بصرہ کے فقیہہ ہو؟"

اس نے جواب دیا: "لوگ یہی خیال کرتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا: "مجھے خبر ملی ہے کہ تم قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہو؟"

اس نے کہا: "جی ہاں!"

اس پر بات آگے چلی ____ یہانتک کہ امام علیہ السلام نے فرمایا: اے قتادۃ! اگر تم قرآن کی تفسیر اپنی مرضی سے کرتے ہو تو خود بھی ہلاک ہوتے ہو اور دوسروں کو بھی ہلاک کرتے ہو اور اگر یہ تفسیر دوسرے لوگوں

سے سن کر کرتے ہو تو بھی ہلاک ہوتے ہو اور ہلاک کرتے ہو، اے قتادہ! تم پر افسوس ہے ______ سن لو کہ قرآن کی معرفت فقط وہی رکھتا ہے جس کو خطاب کیا گیا ہے (یعنی رسول اللہؐ)

ان کے علاوہ بھی اس مضمون پر مشتمل روایات موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ کوئی قرآن کا علم نہیں رکھتا۔

جواب

اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ قرآن کا حق معرفت، یعنی قرآن کی تمام کیفیات، خصوصیات کا علم، اس کے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، ظاہر و باطن اور اس قسم کے دیگر تمام جہات کا علم آئمہ معصومین علیہم السلام کا خاصہ ہے، کیونکہ وہی اہل الکتاب ہیں اور انھیں پر یہ نازل ہوا ہے تو یہ بات حق ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن یہ عقیدہ ظواہر کتاب کے حجت ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ جس امر میں آپ سے ہماری بحث اور نزاع ہے وہ عقیدہ نہیں ______ اسے تو ہم تسلیم کرتے ہیں تاہم قرآن کے ظواہر تمام لوگوں پر حجت ہیں۔

اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس کا ایک کلمہ بھی عام لوگ نہیں سمجھ پاتے، گویا کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ دیگر افراد عامہ کے لیے قرآن مجید معموں پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جو ان کے لیے ناقابل فہم و معرفت ہے۔ پس آپ کا یہ دعویٰ ہمیں تسلیم نہیں اور آپ کی طرف سے پیش کردہ دونوں روایات بھی اس بات کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔

پہلی روایات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ابو حنیفہ پر امام علیہ السلام کو یہ اعتراض تھا کہ وہ قرآن کو اس طرح جاننے کا دعویٰ کر رہے تھے جس طرح جاننے کا حق ہے اور یہ کہ وہ ناسخ و منسوخ وغیرہ تمام امور قرآن پر آگاہ ہیں۔ امام علیہ السلام کا اسے یہ فرمانا کہ "وما ورثك الله تعالیٰ من كتابه حرفاً" اللہ تعالیٰ نے تجھے کتاب خدا میں سے ایک حرف کا بھی وارث نہیں بنایا۔ اس فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن میں سے کسی شے کی فہم و معرفت نہیں رکھتے تھے جیسا کہ "ان اللہ علی کل شیء قدیر" کا معنی کہ جو واضح ہے۔ کیونکہ اگر آپ امام علیہ السلام کے ارشاد کا یہ مفہوم بنائیں گے کہ وہ ابو حنیفہ سے یہی فرمانا چاہتے تھے کہ آپ تو قرآن مجید کے کسی ایک لفظ کا بھی معنی نہیں جانتے، ہاں یہ بات جہاں واضح البطلان ہے وہاں جناب ابو حنیفہ کو حق دیتی ہے کہ وہ امام علیہ السلام پر اعتراض کر دیں اور یہ کلام اسے امام علیہ السلام کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہ کرے۔ حالانکہ روایت سے بظاہر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ امام علیہ السلام کے اس ارشاد کے سامنے تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

معلوم ہوا کہ امام علیہ السلام کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ کے اوصیاء کو کتاب کی میراث اور قرآن کے علم سے مختص فرمایا ہے۔ وہی ہیں جو اسکی جمیع خصوصیات سے آگاہ ہیں اور اس میں ابو حنیفہ کا ادنیٰ سا حصہ بھی نہیں ملا، حتی کہ ایک حرف تک کا بھی حصہ نہیں ملا اور یہی وہ مضمون ہے جو سورہ فاطر میں ادا کیا گیا ہے:

"ثم اورثنا الکتب الذین اصطفینا من عبادنا"

(پھر ہم نے اس کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنھیں اپنے بندوں میں سے ہم نے چن لیا)۔ فاطر: ۳۲)

معلوم ہوا کہ آپ کی پیش کردہ پہلی روایت ہماری موجودہ بحث اور محل نزاع سے بالکل لا تعلق ہے اور آپ کے مدعا کو ثابت نہیں کرتی ہے۔

رہی دوسری روایت تو اس میں بھی قتادہ کو اس بات پر سرزنش کی گئی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تفسیر کے درپے ہوا کرتا ہے۔ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ ظاہر قرآن کو اخذ کرنا اصلاً تفسیر ہے ہی نہیں اور لفظ تفسیر اسے شامل نہیں ہوتا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ظاہری معنی اخذ کرنا قرآن کی تفسیر ہے تو بھی واضح ہے کہ قتادہ فقط اتنی بات کا مرتکب نہ تھا اور ایسی بات پر سرزنش ہونا چاہیے تھی۔ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ لفظ قرآن کو اس کے ظاہری معنی پر حمل کرنا تفسیر بالرائی کے مصادیق میں سے قطعاً شمار نہیں ہوتا۔ اگر اس کے باوجود بھی کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ بھی تفسیر بالرائی ہے تو یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ اس پر دلیل لائے اور ثابت کر کے دکھائے ورنہ ہمارے ہاں تو اس کے بطلان کے لیے فقط عدم احتمال کافی ہے یعنی تفسیر بالرائی کا احتمال نہ ہونا ہی تفسیر بالرائی کے عدم وقوع کا ثبوت ہے کیونکہ اہل علم کے ہاں یہ مقولہ معروف ہے: "اذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال" (جب احتمال آجائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے)۔

☆ ☆ ☆